حکمتِ استعاذہ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

میں (باریابی کی کامل امید رکھتے ہوئے) اللہ کی پناہ مانگتا ہوں

شیطانِ مردود سے (جو نیکی سے دُور اور حسد کی آگ میں جلنے والا ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولای صل وسلم دائماً ابداً علیٰ حبیبک خیر الخلق کلهم

محمد سید الکونین والثقلین والفریقین من عرب ومن عجم

نام کتاب ______ حکمت استعاذہ

مصنف ______ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

اشاعت اول ______ ۱۹۸۶ء

تعداد ______ دو ہزار

اشاعت دوم ______ اپریل ۱۹۸۶ء

تعداد ______ دو ہزار

اشاعت سوم ______ دسمبر ۱۹۸۶ء

تعداد ______ پانچ ہزار

قیمت ______ ۴ روپے

مطبع ______ ندیم یونس پرنٹرز

نوٹ: پروفیسر صاحب کی تمام تصانیف اور خطابات و تقاریر کے ریکارڈ شدہ کیسٹوں سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے ادارہ منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

جاوید القادری

ناظم شعبہ نشر و اشاعت

○

تفسیرِ تسمیہ کا آغاز حکمتِ استعاذہ سے کیا جا رہا ہے ۔ ہر چند کہ استعاذہ بسم اللہ کا حصہ نہیں ہے لیکن چونکہ تلاوتِ قرآن سے پہلے اس کا پڑھنا مستحب ہے ۔ اس لیے اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ تفسیرِ تسمیہ کے ضمن میں پہلے اس کی حکمت واضح کر لی جائے کہ استعاذہ سے مراد کیا ہے ؟ اور اسے تلاوتِ قرآن سے پہلے پڑھنے کا حکم کیوں دیا گیا ہے ؟

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

ان الفاظ کو اصطلاحِ شرع میں "تعوّذ" یا "استعاذہ" کہا جاتا ہے ۔ یہ جملہ اپنی ترکیب اور ہیئتِ لفظی کے اعتبار سے قرآنِ مجید کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس کا حکم ایک قرآنی آیت سے ماخوذ ہے ۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (النحل : ۹۸)

پس جب تم قرآن پڑھنے لگو اللہ کی پناہ مانگو شیطان مردود سے ۔

استعاذہ کی شرعی حیثیت

جمہور علماء کے نزدیک نماز کے علاوہ تلاوتِ قرآن سے پہلے استعاذہ مستحب ہے ۔ امام خازنؒ نے اسے سنت لکھا ہے بلکہ بعض کے نزدیک قرآنی حکم "فاستعذ" اس کے وجوب پر دلالت کرتا ہے ۔ عطاء بن ابی رباحؒ سے یہی منقول ہے ۔ امام ابن سیرینؒ اسقاطِ وجوب کے لیے عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ کا تعوّذ کافی سمجھتے ہیں ۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ قرآنی امر اس کی فرضیت و وجوب کے لیے نہیں بلکہ ندب و استحباب کے لیے وارد ہوا ہے ۔ اس کا ترک شرعاً گناہ نہیں ہے ۔ بخاری ، سُننِ اربعہ اور مسندِ امام احمد میں نماز ، تلاوت اور اس کے علاوہ بھی تعوّذ کا معمول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے ۔

بعض علماء جن میں ابن سیرینؒ ، ابراہیم نخعیؒ ، داؤد ظاہریؒ وغیرہم شامل ہیں ، نے متذکرہ بالا آیت کے ظاہرِ عبارت سے یہ استنباط کیا ہے کہ استعاذہ کا حکم تلاوت کے بعد کے لیے ہے ۔ یہ قول مذہبِ مختار سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ دراصل اس آیت کی ترکیبِ لفظی درج ذیل آیت کے مماثل ہے ۔ جس میں نماز سے پہلے وضو کا حکم صادر کیا گیا ہے ۔ ارشادِ ربانی ہے :-

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ ۔ (المائدہ : ۶)

جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونا چاہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھوؤ ۔

اگر یہاں بھی صرف ظاہرِ عبارت کا مفہوم لیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ "جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو اپنا منہ دھوؤ" ۔ حالانکہ وضو قیامِ صلوٰۃ کے بعد نہیں بلکہ پہلے شرط ہے ۔ چنانچہ اس امر کے پیشِ نظر تمام مفسّرین بالاتفاق "اِذَا قُمْتُمْ

الی الصلوٰۃ کا معنی اِذَا اَرَدْتُمُ الْقِیَامَ (جب تم قیام کا ارادہ کرو) کرتے ہیں یہی اصول آیتِ استعاذہ میں بھی کارفرما ہے ۔ لہذا "اذا قرأت القرآن" کا معنی "اذا اردت القرأۃ" (جب تو قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے) ہوگا ۔ احادیثِ نبوی کے ذریعے بھی یہی مفہوم متعین ہوتا ہے ۔ چنانچہ محض ظاہر عبارت سے اس قول کا استدلال درست نہیں ہے ۔ بنا بریں استعاذہ تلاوت سے قبل ہی مستحب ہے نہ کہ بعد میں ۔

تعوذ کے لیے امام سفیان ثوریؒ ، امام اوزاعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" کے الفاظ پسند کیے ہیں ۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ ، امام مالکؒ ، امام شافعیؒ اور دیگر علماء نے صرف "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" کے الفاظ کو ہی مختار قرار دیا ہے ۔ دونوں اقوال میں کوئی تضاد یا تناقض ہرگز نہیں ۔ جس طرح بھی پڑھ لیا جائے درست ہے ۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں ایک مقام پر اس طرح مذکور ہے:-

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ — اللہ کی پناہ مانگ بے شک وہی سنتا جانتا ہے ۔

(فصلت : ۳۶)

ان دو آیات کے علاوہ بھی قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر استعاذہ کی تلقین کی گئی ہے ۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (اعراف : ۲۰۰) — اور اگر شیطان کی کوئی چھیڑ تجھے اُبھارے تو اللہ کی پناہ مانگ ۔ بیشک وہی سنتا اور جانتا ہے ۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:-

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ o وَاَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ (المومنون : ۹۷، ۹۸) — اور تم کہو کہ اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں شیاطین کے وسوسوں سے اور اے میرے رب، تیری پناہ کہ وہ میرے پاس آئیں ۔

ابوداؤد ، ابن ماجہ اور مسند ابویعلیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استعاذہ اس طرح منقول ہے:-

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ ۔ (الحدیث) — اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں شیطان سے ۔ اس کی سرکشی اور اس کے وساوس سے ۔

استعاذہ کا معنی و مفہوم

استعاذہ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے تین الفاظ کے معانی پر غور کرنا ضروری ہے ۔ اعوذ ، الشیطٰن اور الرجیم

۱۔ اَعُوْذُ ۔ عَاذَ یَعُوْذُ سے متکلم کا صیغہ ہے ۔ یہ "عَوْذ" سے مشتق ہے ۔ جس کا معنی کسی سے التجا کرنا ہے ۔ کہا جاتا ہے "عَاذَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ" (فلاں نے فلاں سے التجا کی) متنبی کہتا ہے ؎

یامن ألوذ بہ فیما أؤملہ — ومن أعوذ بہ ممن أحاذرہ

حافظ ابن کثیرؒ استعاذہ کا معنی یوں بیان کرتے ہیں :۔

هی الالتجاءُ الی الله تعالیٰ والالتصاقُ بجنابهٖ مِنْ شرِ کُلِّ ذی شرٍ (تفسیر ابن کثیر)

استعاذہ اللہ تعالیٰ سے التجا کرنے اور ہر صاحبِ شر کے شر سے پناہ حاصل کرنے کے لیے اس کی بارگاہ سے وابستہ و منسلک ہوجانے کو کہتے ہیں۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں۔

اَلْعَوْذُ اَلْاِلْتِجَاءُ اِلَی الْغَیْرِ وَالتَّعَلُّقُ بِہٖ (المفردات)

عوذ کسی دوسرے سے التجا کرنے اور اس سے منسلک رہنے کو کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ استعاذہ اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے التجاء و استدعا اور اس کے دامنِ رحمت سے تعلق و وابستگی۔ کسی سے التجا و استدعا کے بعد وابستگی اس ذات سے رشتۂ اُمید جوڑ لینے کو ہی کہتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ التجا و استدعا ہمیشہ کسی نہ کسی غرض اور مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ جب کوئی مستدعی کسی شخص سے اپنی التجا بیان کرلیتا ہے تو اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی رہ سکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اپنی التجا کے مقصد و مدعا کے پورا ہونے کی اُمید قائم رہے اور کامیابی ہو اور دوسری یہ کہ ناکامی ہو یعنی اس ذات سے آرزو کے پورا ہونے کی امید باقی نہ رہے۔ پہلی صورت میں ملتجی کا تعلق ملتجی الیہ سے قائم و دائم رہتا ہے۔ کیونکہ تکمیلِ مدعا کی امید رشتے کو بحال رکھتی ہے اور دوسری صورت میں جب کہ ملتجی کی کوئی امید باقی نہ رہے اور تکمیلِ مدعا کی آرزو پوری نہ ہوسکے تو وہ تعلق جو التجا و استدعا سے قائم ہوا تھا ختم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ التجا کے بعد تعلق و وابستگی کا قائم رہنا تکمیلِ آرزو کی امید کی دلیل ہے۔ لہٰذا تعوّذ یا استعاذہ التجا اور امیدِ تکمیل دونوں کا نام ہوا۔ کیونکہ تعوّذ ذاتِ حق سے پناہ مانگنا اور پناہ مل جانے کی کامل امید رکھنا دونوں کو شامل ہے۔ اس لیے لفظِ اعوذ کی معنوی وسعت پکار پکار کر بندگانِ خدا سے کہہ رہی ہے کہ ہر فتنہ و شر سے پناہ کی التجا اللہ تعالیٰ سے کرو اور پھر اس کے دامنِ رحمت سے پُر امید ہوکر وابستہ رہو تمہیں ہر حال میں پناہ مل کر رہے گی۔ کیونکہ سوال و عطا دونوں کا مرجع و مصدر ربِ ذوالجلال ہے۔ "اَعوذ" میں بارگاہِ صمدیت کی کس قدر عظمت پنہاں ہے۔ آپ جتنے انہماک سے اس لفظ کی معنوی وسعت میں گم ہوں گے۔ جنابِ الوہیت کے لطف و انعام کے اتنے ہی نظارے نصیب ہوں گے۔

۲۔ دوسرا لفظ "الشیطٰن" ہے۔ جس کے مادے کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ لفظ "شیطان" "شَطَنَ" سے مشتق ہے اور دوسرا یہ کہ "شَاطَ" سے مشتق ہے۔ دونوں قول درج ذیل ہیں :۔

ا۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں :۔

الشیطان - النون فیه اصلیةٌ وهو من شَطَنَ اَیْ تَبَاعَدَ (المفردات)

لفظِ شیطان میں نون اصلیہ ہے اور وہ شَطَنَ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ہیں وہ دُور ہوا۔

لغتِ عرب میں کہا جاتا ہے "غربةٌ شطونٌ" (دُور کی مسافری)۔ امیہ بن ابی الصلت، نابغہ ذبیانی اور

[illegible] فلاں نے شیطانی فعل کیا) حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں ۔ صحیح یہی ہے کہ شیطان "بُعد" کا معنی رکھتا ہے اور اسی پر کلامِ عرب کی بھی دلالت ہے ۔

ب ۔ امام راغب اصفہانیؒ نے دوسرا قول بھی بیان کیا ہے :۔

قِيلَ بَلِ النُّونُ فِيهِ زَائِدَةٌ مِنْ شَاطَ يَشِيطُ احْتَرَقَ غَضَبًا ، فَالشَّيْطَانُ مَخْلُوقٌ مِنَ النَّارِ كَمَا دَلَّ عَلَيْهِ : وَ خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ (المفردات)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ شیطان میں نُون زائدہ ہے اور یہ شَاطَ یَشِیطُ سے مشتق ہے ۔ جس کا معنی "غصے میں جلنا ہے" کیونکہ شیطان آگ کی مخلوق ہے ۔ جیسا کہ اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے اور جن کو پیدا فرمایا آگ کے شعلے سے ۔

اس معنی کے لحاظ سے شیطان حسد ، بغض ، غصہ اور عناد سے عبارت ہے ۔ خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ پہلے مادۂ اشتقاق کی بنا پر شیطان رحمتِ حق اور نیکی سے دُوری پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے مادۂ اشتقاق کی بنا پر شیطان غصہ وحسد ، بغض وعناد اور تکبر ونخوت کی آگ پر دلالت کرتا ہے ۔

۳ ۔ تیسرا لفظ "الرَّجِيمُ" ہے ۔ جس کا مادہ رَجْمٌ ہے ۔ الرجام پتھر کو کہا جاتا ہے ۔ بنا بریں "الرَّجْمُ ۔ الرمی بالرجام" (پتھر سے مارنا) کے معنوں میں مستعمل ہے ۔ جس پر پتھراؤ کیا گیا ہو اُسے "مرجوم" کہتے ہیں ۔ قرآن میں مذکور ہے کہ قومِ نوحؑ نے تبلیغِ حق کا انکار کرتے ہوئے کہا :۔

قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ (الشعراء : ۱۱۶)

وہ بولے اے نوح اگر تم باز نہ آئے تو ضرور سنگسار کیے جاؤ گے ۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ (الملک ۵)

بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا اور انھیں شیطانوں کے لیے مار بنایا ۔

الرَّجِيمُ دراصل فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول ہے جو "مرجوم" یعنی "مَطْرُودٌ عَنِ الْخَيْرِ" (خیر اور نیکی سے بھگایا ہوا یا محروم کیا ہوا) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ الرَّجِيمُ کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ فاعل کے طور پر راجم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ حافظ ابن کثیرؒ اس کی وجہ لکھتے ہیں :۔

لِأَنَّهُ يَرْجُمُ النَّاسَ بِالْوَسَاوِسِ (تفسیر ابن کثیر)

کیونکہ یہ لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے ۔

قرآنِ حکیم میں مذکور ہے :۔

"الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (الناس)

جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں ۔ جنات میں سے اور آدمیوں میں سے)

[illegible] ذہیں

الشیطان الرجیم کے معنوی اطلاقات

یہ امر متفق علیہ ہے کہ استعاذہ یا تعوذ "شیطانِ رجیم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے اور اس شر سے بچ جانے کی امید کا نام ہے۔ اب یہ پہلو غور طلب ہے کہ "الشیطان الرجیم" کا معنوی اطلاق کس شے پر ہوتا ہے۔ پہلے کی گئی لغوی معنی و مفہوم کی بحث سے کافی حد تک اس لفظ کے اصطلاحی اطلاقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ میرے نزدیک "الشیطان الرجیم" کے تین اطلاقات ہیں۔ جن کی تائید و تصدیق قرآن و حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

● پہلا اطلاق

"الشیطان الرجیم" کا پہلا اور معروف اطلاق ایک مخصوص فرد پر ہوتا ہے۔ جس کا تعلق گروہِ جنّات سے ہے اور اس کا نام "ابلیس" ہے۔ اسی کو عرفِ عام میں "شیطان" کہتے ہیں۔ اس کا ذکر قرآنِ کریم میں متعدد بار آیا ہے۔ غالباً سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ "سورۃ الاعراف" میں ہے جو آیت ۱۱ سے ۳۰ تک محیط ہے۔ ابلیس کے "شیطان" قرار پانے کی وجہ قرآن خود بیان کرتا ہے:۔

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ط قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ

(اعراف ۱۱، ۱۲، ۱۳)

پھر ہم نے ملائکہ سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ سب سجدے میں گرے سوائے ابلیس کے۔ یہ سجدہ کرنے والوں میں نہ ہوا۔ فرمایا کس چیز نے تجھے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ بولا میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور اسے مٹی سے بنایا۔ فرمایا تو یہاں سے اُتر جا۔ تجھے یہ حق نہیں کہ یہاں رہ کر تکبّر کرے۔ نکل جا۔ تو ذلّت والوں میں سے ہے۔

اس سے آگے پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا

(اعراف: ۱۸)

فرمایا یہاں سے نکل جا (تو ہماری رحمت سے) روکا گیا ہے اور تو ہماری بارگاہ سے) راندہ گیا ہے)

سورۃ الحجر میں اسی واقعے پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ آدم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ

پس جب میں اسے ٹھیک کر لوں اور اس میں اپنی طرف کی خاص رُوح پھونک لوں تو اس کے لیے سجدے میں

كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (الحجر ۲۹، ۳۰)

...فرشتے سب کے سب سجدے میں گر پڑے سوائے ابلیس کے۔ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ فرمایا اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں سے الگ رہا۔ بولا مجھے زیبا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے بجتی مٹی سے بنایا جو سیاہ بودار گارے سے تھی۔ فرمایا تو جنت سے نکل جا کہ تو مردود ہے اور بیشک قیامت تک تجھ پر لعنت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو خلعتِ خلافت و نبوت سے سرفراز کر کے ان کی فضیلت و عظمت کا سرِعام اعتراف کرانے کے لیے سجدۂ تعظیمی کا حکم صادر فرمایا جسے تمام ملائکہ نے بلا تامل تسلیم کر لیا۔ لیکن ابلیس عظمتِ آدم کے سامنے سربسجود ہونے کے لیے تیار نہ ہوا۔ بلکہ اس نے اپنے انکار کا یہ جواز پیش کیا کہ میں آدم سے افضل ہوں۔ سورۂ اعراف اور سورۂ حجر کے دونوں مقامات پر یہ صراحت سے مذکور ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے ان کی فضیلت سے انکار کر دیا۔ جس پر وہ غضبِ الٰہی کا مستحق قرار پایا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ ایک بشر جس کی تشکیل مٹی کے گارے سے ہوئی ہے مجھ سے کیونکر افضل ہو سکتا ہے۔ بارگہِ الوہیت میں یہی دلیل اس کے ملعون ہونے کا باعث ہو گئی۔ حالانکہ بشریتِ آدم اور اس کی تشکیل کا ذکر کم و بیش اسی انداز میں اللہ تعالیٰ نے پہلے خود ہی فرما دیا تھا :-

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر : ۲۸)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں آدمی کو بنانے والا ہوں بجتی مٹی سے جو بودار سیاہ گارے سے ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کی تخلیق کا ذکر اس انداز میں کرنا محض اظہارِ مقصود کے لیے تھا۔ اس میں تنقیص نہ تھی جب کہ ابلیس بشریتِ آدم کا ذکر صرف انکارِ فضیلتِ آدم کی دلیل کے طور پر کر رہا تھا اور اس کا نقطۂ نظر بجائے اعترافِ عظمت کے حضرت آدم کے ساتھ اپنا موازنہ تھا۔ یہ پہلو تنقیصِ نبوت کی طرف راجع تھا اور اس کی یہی سوچ حکمِ الٰہی سے انحراف کی بنیاد بنی۔ جس پر اسے ابدالآباد تک کے لیے رحمتِ الٰہیہ سے دُور، قربِ ایزدی سے محروم اور بارگہِ ربوبیت سے مطعون کر دیا گیا اور قرآنی ارشاد کے مطابق وہ "شیطانِ رجیم" کا مصداقِ اتم قرار پا کر ہمیشہ کے لیے لعنت کا مستحق ہو گیا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے "الشیطان" اور "الرجیم" کے القاب سے یاد کیا۔ کیونکہ لفظ شیطان اپنے ایک معنی کے اعتبار سے دُوری پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے ابلیس کو اس نام سے موسوم کیا گیا کہ وہ تنقیصِ نبوت اور حکمِ الٰہی سے تمرّد و انحراف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی بارگاہِ عافیت سے دُور کر دیا گیا ہے اور یہ لفظ اپنے دوسرے معنی کے اعتبار سے حسد و عداوت کی آگ میں جلنے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس لیے ابلیس کو شیطان کہا گیا ہے کیونکہ وہ عظمت و فضیلتِ

[illegible] تعالیٰ کے حکم سے بھی کھلی بغاوت پر تُل گیا۔ چنانچہ یہ دونوں الفاظ ابلیس کے لیے قرآنِ حکیم میں متفرق طور پر بھی اور اکٹھے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ (التکویر: ۲۵) اور قرآن شیطانِ مردود کا قول نہیں ہے۔

● دوسرا اطلاق

"الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" کا دوسرا اطلاق نوعِ انسانی اور جنّات کے اُن تمام افراد پر ہوتا ہے جو اپنے فکر و عمل کے اعتبار سے شیطنت کے مظاہر ہیں۔ شیطنت اپنے وسیع مفہوم کے لحاظ سے حسد، عداوت، بغض و عناد، فتنہ و شر اور وسوسہ اندازی کی تمام صورتوں کو محیط ہے۔ اس لیے وہ تمام افراد جو ایسے خصائلِ ذمیمہ سے متصف ہو کر مخلوقِ خدا کو مصائب و آلام، فتنہ و شر اور وسوسہ و تفرقہ کی آگ میں جھونکتے پھرتے ہوں۔ ان کے شر سے پناہ مانگی جائے۔ قرآنِ حکیم جنات اور انسانوں کے دونوں طبقات میں سے ایسے افراد کو "شیطان" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ (الاعراف: ۱۱۳)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن بنائے ہیں شیطان آدمیوں اور جنّوں میں سے۔ وہ ایک دوسرے کے دل میں دھوکے کے لیے مصنوعی بات خفیہ طور پر ڈالتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کفر و طاغوت کے ان علمبرداروں کو بھی شیطان کہتا ہے جو ہر وقت اہلِ ایمان کے اغوا، و اضلال میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ (البقرۃ: ۱۴)

اور جب وہ اپنے شیطانوں سے علیحدہ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ ہم ان سے محض دھوکہ اور مذاق کرتے ہیں۔

دوسرے اطلاق کے اعتبار سے "شیطان" متعدد افراد کا لقب ہے جو ہر وقت انسانوں کو حق و صواب اور امن و آشتی سے محروم کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔ قرآنِ حکیم ان کے اس منصوبے کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ (الانعام: ۱۲۲)

اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں یہ خیال ڈالتے رہتے ہیں کہ تم سے جھگڑا کریں۔

شیطانی شر کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی صورت

پہلی صورت دل میں کوئی خیال یا وسوسہ ڈال کر کسی غلط کام کے لیے اُکسانا ہے۔ جھوٹی افواہیں بھی اسی قبیل سے ہیں۔ اسی سے افراد کے درمیان غلط فہمیاں، عداوتیں اور نفرتیں جنم لیتی ہیں۔ اس کا ذکر قرآن میں یوں آتا ہے:۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (الاعراف: ۲۰) پھر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ (خطرہ) ڈال دیا۔

اسی طرح سورۃ الناس میں فرمایا گیا ہے :-

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (الناس: ۴، ۵، ۶)

(میں پناہ مانگتا ہوں) اس کے شر سے جو دل میں برے خطرے ڈالتا ہے اور دبک رہتا ہے۔ وہ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں جنوں میں سے اور آدمیوں میں سے

ہماری سوسائٹی میں اس کی عملی مثال کسی کے خلاف شرانگیز اور بے بنیاد پروپیگنڈا کرنا ہے جو کئی لوگ اپنے مذموم مقاصد کے لیے اکثر کرتے رہتے ہیں۔

دوسری صورت

دوسری صورت جادو کے شر کی ہے۔ یہ بھی شیاطین کا کام ہے۔ اسے اسلام نے کفر سے تعبیر کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

مَنْ اَتٰى سَاحِرًا اَوْ عَرَّافًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (الحدیث)

جو شخص کسی جادوگر یا قسمت کا حال بتانے والے کے پاس گیا۔ پس اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی ہدایت سے کفر کیا۔

اس لیے قرآن نے جادو کے شر سے بھی پناہ مانگنے کا حکم صادر فرمایا ہے :-

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ (الفلق : ۴)

اور ان عورتوں کے شر سے (پناہ مانگتا ہوں) جو گرہوں میں پھونکتی ہیں۔

لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ ہر تکلیف اور مصیبت کو جادو یا جنات کے اثرات کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ ایسا خیال جہالت کے باعث ذہنوں میں آتا ہے۔

تیسری صورت

تیسری صورت رشک اور حسد کے شر کی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا :-

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (الفلق : ۵)

اور پناہ مانگتا ہوں حسد والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔

حسد کا شر دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ حاسد کسی کو بہتر حالت میں دیکھ کر جل اٹھے گا اور اسے نقصان پہنچانے کا کوئی دقیقہ بھی فروگزاشت نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس شرانگیز کوشش سے جو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے اس سے پناہ طلب کی جائے۔ دوسری یہ کہ رشک وحسد بذاتِ خود ایک ایسی آگ ہے جو غیر حسی اور غیر مرئی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی شرانگیزی سے دوسرے شخص کو بغیر کسی ظاہری کوشش کے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی کو عرفِ عام میں نظر بد کہتے ہیں۔ بعض لوگ اسے وہم سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ فی الواقع اپنا اثر رکھتی ہے اور اسی کو شیطانی شر قرار دیتے ہوئے

قرآن اس سے پناہ مانگنے کی تلقین کرتا ہے۔ جس طرح جادو بغیر مادی محسوس اور بلا قلم و دوات کے اپنی اثر انگیزی اور غیر معمول نتائج رکھتا ہے اور اس امر پر متعدد قرآنی آیات و واقعات اور احادیث نبوی صراحت کے ساتھ شاہد ہیں۔ اسی طرح رشک وحسد کی نظر بھی شر کا باعث ہو سکتی ہے۔

شرِ نظر کا ثبوت

یعقوب علیہ السلام نے اپنے جوان بیٹوں کو مصر میں غلہ لینے کے لیے بھیجا تو انھیں نصیحت کی :۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ

(یوسف : ۶۷)

اور کہا اے میرے بیٹو تم سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا۔ بلکہ جُدا جُدا دروازوں سے جانا میں تمہیں اللہ (کی تقدیر) سے بچا نہیں سکتا۔ حکم تو سب اللہ ہی کا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

یعقوب علیہ السلام پیغمبر برحق ہو کر اپنے بیٹوں کو نظرِ بد سے بچنے کی تدبیر بتا رہے ہیں اور یہاں حکم توکل کا مطلب یہ ہے کہ تدبیر میرا فرض ہے سو میں نے پورا کر دیا لیکن تدبیر تقدیر کو بدل نہیں سکتی۔ اس لیے باوجود تدبیر کے بھروسہ اللہ تعالےٰ ہی کی رحمت پر کرنا چاہیئے۔ یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ کے گیارہ کے گیارہ بیٹے جوان خوبصورت اور صحت مند تھے۔ انہیں ایک دروازے سے گزرتا یعنی اکٹھا دیکھ کر کوئی شیطانی خصلت کا شخص رشک وحسد کی نظر کر سکتا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹوں کو نظرِ بد سے بچنے کی تدبیر بیان کر دی۔ اگر نظرِ بد کے شر کا کوئی وجود ہی نہ ہوتا تو پیغمبرِ خدا کبھی بھی ایسی تلقین نہ کرتے جو سراسر وہم پر مبنی ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں:۔

اِنَّ الْعَيْنَ حَقٌّ (متفق علیہ) بیشک نظر کا لگنا حق ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ اور تابعین میں سے محمد بن کعب، مجاہد، ضحاک، قتادہ، سدی وغیرہم سورۂ یوسف کی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں :۔

ذالك انهم كانوا ذوي جمال و هيئة حسنة ومنظر وبهاء فخشي عليهم ان يصيبهم الناس بعيونهم فان العين حق تستنزل الفارس عن فرسه.

(تفسیر ابن کثیر)

یعقوبؑ کا یہ ارشاد اس لیے تھا کہ ان کے بیٹے صاحبِ جاہ وجمال اور صاحبِ قوت وقامت تھے۔ پس انہیں خوف ہوا کہ کہیں لوگ ان کو نظر کے ذریعے نقصان نہ پہنچا دیں۔ کیونکہ نظر کا لگنا حق ہے۔ نظر کے اثر کا تو یہ عالم ہے کہ یہ سوار کو گھوڑے سے نیچے گرا دیتی ہے۔

عظیم محدث ومفسر امام بغویؒ فرماتے ہیں :۔

ذالك انه خاف عليهم العين — فامرهم ان يتفرقوا فى دخولهم لئلا يصابوا العين فانّ العين حقٌ وجاء فى الاثر انّ العين تدخل الرجل القبر

(تفسیر معالم التنزیل)

اس کی وجہ یہ تھی کہ یعقوبؑ کو ان پر نظر لگنے کا خوف تھا پس انہوں نے اپنے بیٹوں کو الگ الگ داخل ہونے کا حکم دیا تاکہ وہ نظر سے بچ جائیں۔ کیونکہ نظر کا لگنا حق ہے احادیث و آثارِ صحابہ میں آیا ہے کہ نظر کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ یہ آدمی کو قبر میں بھی داخل کر دیتی ہے۔

اسی قسم کا ایک ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے۔ قال (صلی اللہ علیہ وسلم) العین حقٌ ولو کان شیٔ سابق القدر لسبقته العین واذا استغسلتم فاغتسلوا۔

اسی طرح حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:۔

کان یؤمر العائن فیتوضأ ثم یغتسل منه المعین

(ابوداؤد)

حضورؐ کا معمول یہ تھا کہ اگر کسی کو نظر لگ جاتی تو نظر لگانے والے کو وضو کا حکم دیتے اور اس پانی سے اس شخص کو نہلا دیتے جسے نظر لگی ہوتی تھی۔

امام نوویؒ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں کہ بنا بریں جمہور علماء کا مذہب یہی ہے کہ نظر کا لگنا حق ہے (الخازن) اس امر کی تائید "موطا امام مالک" میں مروی سہیل بن حنیفؓ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ امام خازن، امام رازیؒ اور دیگر مفسرین نے دلائل کے ساتھ اسی مفہوم کو ثابت کیا ہے۔ قاضی بیضاوی اور علامہ زمخشریؒ نے نظر سے پناہ مانگنے کو سنّتِ نبوی قرار دیتے ہوئے یہ حدیث بیان کی ہے۔ جس میں منقول ہے کہ حضور علیہ السلام اس طرح تعوذ فرمایا کرتے بالخصوص امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے لیے ان الفاظ میں استعاذہ کرتے تھے:۔

اعیذ کما بکلمات اللہ التامة، من کلِّ عینٍ لامّة و مِن کل شیطانٍ وھامّة

(بخاری، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں:۔

اللّٰھم انی اعوذ بکلمات اللہ التامّة من کل شیطانٍ وھامّةٍ ومن کل عینٍ لامّةٍ

(الحدیث)

اے اللہ میں تیرے کامل کلمات کی پناہ مانگتا ہوں ہر وسوسہ اندازی کرنے والے شیطان سے اور ہر نقصان پہنچانے والی نظر سے۔

مذکورہ بالا احادیث و آثار سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ شیطانی اثرات میں سے ایک اثر نظر کا لگنا بھی ہے اور اس سے پناہ مانگنے کی تلقین بھی شریعتِ مطہرہ نے کی ہے۔ اس سے بچاؤ کی تدابیر شرعاً تدابیر ہی کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن کا اختیار کرنا جائز اور مشروع ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ تدابیر تقدیر کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ اگر اذنِ الٰہی یہی ہو کہ نظر سے کسی کو نقصان پہنچ کر رہے تو ضروری نہیں کہ اس تدبیر سے مطلوبہ حفاظت یقینی طور پر ہو جائے۔ حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ

[illegible] ہے۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پناہ مانگنے کی تعلیم فرمائی ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے شر سے حفاظت کی بہترین صورت استعاذہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو ذات کوئی امر مقدر کرتی ہے وہی اس کو بدل دینے پر بھی قادر ہے۔ لہٰذا اسی سے ہر حال میں پناہ طلب کی جانی چاہیئے۔

شرِ نظر کے تصور کی وضاحت چند احادیث اور علماء و مفسرین کی تحقیقات سے اس لیے کر دی گئی ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ نظرِ بد کا لگنا توہم نہیں بلکہ احادیث سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔ آج کل تعقل پسند طبقہ عقلیت کی رو میں بہہ کر ہر اس چیز کو توہم قرار دیتے ہوئے رد کر دیتا ہے جو محدود فکری وسعت، قلتِ مطالعہ اور ناقص عقل استعداد کے باعث اسے سمجھ نہیں آتی۔ اس مسئلے کی تفصیلات یہاں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ اس لیے اس قدر بیان پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

سورۃ الفلق کا شانِ نزول بھی حسد اور جادو کے شر سے متعلق ہے۔ جب ایک یہودی جادوگر لبید بن عاصم اور اس کی بیٹیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تو اس ضمن میں سورۃ الفلق نازل کی گئی۔ چنانچہ اس کے پڑھنے سے جادو کے جملہ اثرات زائل ہو گئے۔ واقعہ کی تفصیلات اپنے موقع پر آئیں گی۔ اس وقت صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ایسے شیطانی اثرات فی الحقیقت موجود ہوتے ہیں۔ انہیں توہم کی کارفرمائی یا ضعیف الاعتقادی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ان پر اس انداز سے اعتقاد رکھنا کہ انسان انھیں استعمال میں لائے یا ان کی طرف راغب ہو تو یہ اسلام میں کفر و طاغوت کا درجہ رکھتا ہے۔ گویا ان کے وجود کو ماننا منع نہیں۔ ان کی طرف عملاً متوجہ ہونا منع ہے۔

چوتھی صورت

چوتھی صورت شیاطین چونکہ جنات کے ایک ایسے گروہ کا بھی نام ہے جو فاسق و فاجر یا کافر و منافق اور شریر ہوتے ہیں۔ وہ بنی نوعِ انسان کو مختلف طریقوں سے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کے شر سے بھی پناہ مانگنی چاہیئے۔ انسان پر جنات کا ایسا اثر جس سے اس کے عقل و حواس مختل ہو جائیں قرآن کی رُو سے ممکن ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہلاء اپنی کم فہمی کی بناء پر اور عیار و مکار لوگ اپنے مادی منافع کی غرض سے انسانی امراض و عوارض کو جنات کے شر سے موسوم کرنے لگیں۔ جس طرح ہمارے معاشرے میں سادگی اور جہالت کی وجہ سے یہ کاروبار ہو رہا ہے۔ خاص طور پر امراضِ نسوانی کو جنات کے اثرات سے موسوم کر دیا جاتا ہے اور اس جہالت کے باعث ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ جہاں تک اس امر کی صحتِ امکان کا تعلق ہے۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ سود خور قیامت کے دن آسیب زدہ شخص کی طرح مختل و مبہوت ہو کر اُٹھے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ط

(البقرہ : ۲۷۵)

وہ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جسے آسیب (جنّ شیطان) نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو۔

لہذا شیاطین کے اس شر سے بھی پناہ مانگنا استعاذہ ہی کا حصہ ہے۔

پانچویں صورت

پانچویں صورت شیاطین کی ایسی گمراہی پھیلانے کی ہے۔ جس کا شعور تک انسان کو نہیں ہوتا۔ شیطان کسی معاملے میں خواہ نجی و انفرادی ہو یا مذہبی و سیاسی ایسی منفی سوچ انسانی ذہن میں بٹھا دیتا ہے۔ جسے آدمی حق سمجھتا ہے حالانکہ وہ باطل ہوتی ہے اور وہ شخص اس کی حمایت میں بسا اوقات کٹ مرنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اعتقادی اور عملی سطح پر انسان کو گمراہ کرنے کی کاوشیں شیاطین ہر وقت جاری رکھتے ہیں۔ لیکن انسان کو انکا علم تک نہیں ہوتا۔ قرآنِ حکیم میں ہے کہ شیاطین ہر وقت تمہاری تاک میں رہتے ہیں:۔

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ (الاعراف: ۲۷)

بیشک وہ (یعنی ابلیس) اور اس کا کنبہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں کہ تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ بیشک ہم نے شیطانوں کو ان کا دوست کیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

شیاطین کی گمراہی پھیلانے کا ذکر اس سے آگے یوں آیا ہے۔

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ؕ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ (اعراف: ۳۰)

ایک فرقے نے ہدایت پائی اور ایک فرقے کی گمراہی ثابت ہوگئی۔ انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنا لیا اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔

چنانچہ "الشیطان الرجیم" کا اطلاق ایسے تمام شیاطین اِنس و جنّ پر ہوتا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں فتنہ و شر پیدا کرکے بنی نوع انسان کا سکون و طمانیت تہ و بالا کرتے اور انھیں راہِ حق و ہدایت سے بھٹکاتے رہتے ہیں۔

● تیسرا اطلاق

"شیطان رجیم" کا تیسرا اطلاق "جنسِ شیطنت" پر ہو سکتا ہے۔ جس طرح پہلے بیان کیا گیا ہے کہ شیطان شَطَنَ سے مشتق ہو تو اس کا معنیٰ دُوری ہوگا۔ اگر شَاطَ یَشِیْطُ سے مشتق ہو تو اس کا معنیٰ حسد و عداوت کی آگ میں جلنا اور کذب و باطل ہوگا۔ چنانچہ لفظِ شیطان کے لحاظ سے استعاذہ کا اطلاق اس طرح ہوگا کہ میں خدا کی رحمت و ہدایت سے دُوری، حسد و عداوت جیسے تمام خصائلِ ذمیمہ اور ہر کذب و باطل سے پناہ مانگتا ہوں۔ اسی طرح الرجیم خواہ راجم کے معنی میں استعمال ہو یا مرجوم کے۔ اس کا اطلاق بھی اس طرح ہوگا کہ میں بارگاہِ اُلوہیت سے دھتکارے جانے سے پناہ مانگتا ہوں اور ہر فتنہ و شر اور وسوسہ اندازی سے بھی پناہ مانگتا ہوں۔ گویا انسان ہر اس عمل سے پناہ مانگے جو اس کو خدا کی رحمت اور قرب سے دُور کردے۔ ہر وہ کام جو باطل ہو اور حق و صداقت سے متصادم ہو شیطنت ہے اور اس سے گریز لازم ہے۔ اسی طرح انسان ہر حال میں بغض و عناد، رنج و حسد، رعونت اور کبر و نخوت

جیسے رذائلِ اخلاق سے پرہیز کرے۔ کیونکہ اس سے انسانی شخصیت نہ صرف غیر متوازن بلکہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ شخصیت کو متوازن اور مضبوط بنانے کے لیے ان ذمائم سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے استعاذہ کے ذریعے انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے ان خصائل سے اپنا دامن پاک رکھنے کی دُعا تعلیم کی ہے اور ان کو لعنت قرار دیا ہے تاکہ انسان طبعاً ان سے آلودہ ہونے میں عار محسوس کرے۔

استعاذہ کی حکمت و فلسفہ

استعاذہ کا معنی و مفہوم اور اس کے مختلف اطلاقات سمجھ لینے کے بعد اب ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کی حکمت و مصلحت کیا ہے؟ آخر مسلمانوں کو شیطانِ رجیم سے خواہ وہ ابلیس ہو، شیاطینِ انس و جن ہوں یا خصائلِ ذمیمہ کی صورت میں جنسِ شیطنت ہر پناہ مانگنا کیوں ضروری ہے۔ اس کے مقاصد و نتائج کیا ہیں؟ اس حکم کی متعدد حکمتیں ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے۔

پہلی حکمت

حکمِ استعاذہ کی پہلی حکمت یہ ہے کہ جب ابلیس نے بارگاہِ ربوبیت میں تمرّد و انحراف کی راہ اختیار کی اور اس کے نتیجے میں اسے مردود و ملعون بنا کر بھگا دیا گیا تو اس نے بنی نوعِ انسان اور بالخصوص مسلمانوں کو راہِ حق سے گمراہ کرنے کا حلف اٹھایا اور اس عزم کا اظہار اسی موقع پر برملا کر دیا۔ جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں اس طرح موجود ہے:-

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ
(صٓ : ۸۲، ۸۳)

بولا تیری عزت کی قسم ضرور میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا مگر ان میں جو تیرے چُنے ہوئے بندے ہیں (انہیں گمراہ نہیں کر سکتا)

اس کے بعد ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ○ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ
(صٓ : ۸۴، ۸۵)

فرمایا تو سچ یہ ہے اور میں سچ ہی فرماتا ہوں۔ بیشک میں (بھی) یقیناً جہنم بھر دوں گا تجھ سے اور ان سب سے جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر شیطان کے اس عزم کا بیان ہے اور اسے اس دنیائے آب و گل میں اپنا کام سرانجام دینے کی آزادی اور مہلت مل جانے کا بھی ذکر ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَا اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ
(الحجر : ۳۹)

بولا اے میرے رب قسم اس کی جو تو نے مجھے گمراہ کیا۔ میں (اس کے بدلے) انسانوں کو زمین میں بھلاوے دوں گا اور ضرور میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔ سوائے ان کے جو تیرے چُنے ہوئے بندے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ حقیقت مترشح ہو گئی کہ شیطانی طاقت نسلِ انسانی کو راہِ ہدایت سے بھٹکانے اور گمراہی وضلالت کے گڑھوں میں دھکیلنے کے لیے مصروفِ کار رہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو اپنے ساتھ ملالے۔ اس مقصد کے لیے وہ طرح طرح کے حربے استعمال کرتی ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (الاعراف: ١٧)

پھر میں ضرور (انھیں گمراہ کرنے کے لیے) ان کے پاس آؤں گا ان کے آگے اور ان کے پیچھے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔

ایک اور مقام پر مذکور ہے:-

لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۙ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ط وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا (النساء: ١١٨، ١١٩)

(اللہ نے اس پر لعنت کی اور وہ بولا قسم ہے میں ضرور تیرے بندوں میں سے مخصوص تعداد ہتھیا لوں گا۔ قسم ہے میں ضرور انہیں بہکا دوں گا اور انھیں یقیناً (طرح طرح کی) آرزوئیں دلاؤں گا اور انھیں یقیناً کہوں گا۔ وہ چوپایوں کے کان چیریں گے اور انھیں ضرور کہوں گا وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزیں (یا شکلیں) بدل دیں گے اور جو اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے وہ صریح نقصان میں پڑا۔

جب راہِ حق سے بہکانے کی کوششیں متعدد انواع واقسام کی ہوں اور کئی محاذوں پر گمراہی وضلالت کے لیے جنگ ہو رہی ہو تو ان سے بچاؤ کے لیے انسان خود کو کافی نہیں سمجھ سکتا اور پھر شیطانی گمراہی کا عالم یہ ہے کہ اکثر اوقات انسان کو اپنے عقائد واعمال کی صحت وحقانیت پر یقین رہتا ہے اور وہ خود کو غلط راستے پر تصور ہی نہیں کر سکتا بلکہ دوسروں کو گمراہ قرار دیتا رہتا ہے۔ جب کسی کو اپنی گمراہی کا شعور بھی نہ ہو تو اسے راہِ حق کے تلاش کرنے کی آرزو یا سعی وکاوش کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انسان اس صحرائے حیات میں جس میں ہر سو دجل وفریب اور مکر وضلالت کی آندھیاں چل رہی ہیں خود کو صرف اپنی عقل وفہم کی بنا پر محفوظ ومامون نہیں کر سکتا۔ اسے یقیناً کسی ایسی ہستی کے دامن سے وابستہ ہونا ہوگا جو ہادی ہو اور اس کی ہدایت عطا کرنے کی قوت تمام گمراہیوں پر محیط ہو تاکہ اس کی پناہ میں آکر انسان کسی شیطانی ضلالت کا شکار نہ ہو سکے اور یہ معاملہ خود کو احکم الحاکمین کے سپرد کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ انسان ہمہ وقت شیطانی قوت کی تباہ کاریوں اور فسوں انگیزیوں سے بچنے کے لیے میری پناہ طلب کرے کیونکہ مجھ پر توکل کرنے والے اور میرے دامنِ رحمت سے وابستہ رہنے والے شیطان کے دامِ تزویر میں نہیں آسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار شیطان بھی اپنے عزم وہمت کا اظہار کرتے ہوئے خدا کے برگزیدہ اور مقبول ومنتخب

بندوں کے معاملے میں اپنی بے بسی کا اعتراف کر رہا ہے کہ میں ہر ایک کو گمراہ کروں گا لیکن اللہ کے مخلص بندے میرے دستِ اضلال سے محفوظ رہیں گے ۔ اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (النحل : ۹۹)	بے شک شیطان کا کوئی قابو ان لوگوں پر نہیں جو ایمان لائے اور اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں

دوسری حکمت

حکم استعاذہ کی دوسری حکمت یہ ہے کہ اس دعا کے ذریعے انسان اپنے گردو نواح میں بسنے والے بیشمار شیطانی خصلت کے حامل افراد کے شر و فساد اور حسد و عداوت سے محفوظ رہے ۔ کیونکہ ابلیس کے علاوہ بھی کئی افراد از قبیلِ جنّ و انس ایسے ہیں جو منفی اور تخریبی مقاصد کے لیے دوسرے لوگوں کے جائز حقوق و مفادات کو نقصان پہنچانے پر تُلے رہتے ہیں ۔ مخالفت و مخاصمت اور بغض و عناد کی وجہ سے دوسروں کے خلاف طرح طرح کی سکیمیں سوچتے اور منصوبے بناتے رہتے ہیں ۔ ایسی تمام سازشی کاوشیں دراصل شیطنت کی ہی مختلف صورتیں ہیں ۔ باری تعالٰے نے انسان کو ان کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی پناہ حاصل کرنے کی تلقین کی ہے ۔

تیسری حکمت

شیطانِ رجیم چونکہ رذائلِ اخلاق کی مجسم صورت بھی ہے ۔ اس لیے استعاذہ میں ایک حکمت یہ ہے کہ انسان خود کو بُری خصلتوں اور خسیس خواہشوں سے پاک رکھے ۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفاتی مظہریت کا اہل بنانے کے لیے اس کے باطن کو تمام ناپسندیدہ اوصاف سے منزّہ کرنا چاہا ہے ۔ رذائل اخلاق کی آلودگیوں سے نجات حاصل کیے بغیر انسان تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہِ (خدا کے اوصاف کے رنگ میں رنگے جاؤ) کا مصداق نہیں ہو سکتا ۔ عَاذَ یَعُوْذُ میں التجا کرنے اور وابستہ ہونے دونوں کا معنی پایا جاتا ہے ۔ اس لیے حکمتِ استعاذہ بھی یہی ہے کہ انسان بارگہِ ایزدی میں رذائل سے پاک ہونے کی التجا کرے اور فضائل سے متصف ہونے کے لیے اس کے دامنِ رحمت سے متصل ہو جائے ۔ یہ التجا و اتصال اسے طہارت و پاکیزگی بھی عطا کرے گا اور عظمت و فضیلت کے اعلیٰ مقام پر بھی فائز کرے گا ۔ گویا استعاذہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ استغفار ہے ۔

چوتھی حکمت

استعاذہ کی ایک حکمت انسان کے باطنی کمالات کے حصول سے متعلق ہے ۔ شیطان دُوری پر اور رجیم ملامت و شقاوت پر دلالت کرتا ہے ۔ گویا استعاذہ کے ذریعے انسان کو خدا سے دُوری اور شقاوت سے توبہ کی تلقین کی گئی ہے ۔ یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں کیونکہ خدا سے دُوری ، شقاوت کا سبب ہے اور شقاوت ، خدا سے دُوری کا ۔ خدا سے دُوری قربِ الٰہی کے منافی ہے ۔ اور شقاوت ، سعادت کے ۔ کیونکہ تمام تر روحانی کمال قربِ الٰہی اور سعادت پر منحصر ہے ۔ اس لیے انسان کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ خدا سے بُعد اور شقاوت دونوں سے پناہ مانگے کہ جب اسے دُوری سے

نجات ملے گی تو قرب از خود میسر آجائے گا اور شقاوت سے نجات ملے گی تو سعادت از خود نصیب ہو جائے گی۔ اس میں ایک اور لطیف نکتہ قابلِ غور ہے کہ براہِ راست قرب و سعادت مانگنے کی بجائے دُوری اور شقاوت سے پناہ مانگنے میں ادب اور اظہارِ تذلل زیادہ ہے اور یہی مقصودِ روحانیت ہے۔

پانچویں حکمت

استعاذہ کی علمی حکمت یہ ہے کہ انسان کو اپنے عجز و بے بسی کا علم ہو جائے وہ یہ سمجھ لے کہ میں دینی و دنیوی منافع کے حصول اور نقصانات سے بچاؤ پر خود قادر نہیں ہوں۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان شاملِ حال نہ ہو میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ احساس اور علم و شعور ہے جو انسان کو صحیح عظمت سے ہمکنار کرتا ہے۔ اگر اس کا فقدان ہو اور انسان خود کو قادرِ مطلق اور غنی و بے نیاز سمجھ لے تو اس سے غرور و تکبر اور نخوت و فرعونیت جنم لیتی ہے جو انسان کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو غارت کر کے، اسے دنیا میں ذلیل و رُسوا کر دیتی ہے۔ آداب و شرائطِ عظمت کا یہی سنگِ بنیاد ہے کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کے باوجود خود کو عاجز سمجھے اور انھیں بروئے کار لاتے ہوئے بھی صحیح نتائج کے لحاظ سے ربّ العالمین کی رحمت اور عطا و شفقت کا طلب گار رہے۔ حکمِ استعاذہ کا فلسفہ یہی ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کفر و طاغوت، فتنہ و شر اور شیطنت کی تمام قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہتے ہوئے یہ خیال ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں آنا چاہیئے کہ میں خود کو محض اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر شیطانی شر سے محفوظ اور ان باطل قوتوں کو زیر کر سکتا ہوں۔ یہی احساسِ عجز اسے کامیابی کے لیے مزید مضبوط ہونے کا محرک (INCENTIVE) بھی فراہم کرے گا۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہ کے الفاظ خود ہی صراحت کے ساتھ انسان کے محتاج ہونے اور اللہ تعالیٰ کے غنی و بے نیاز ہونے پر دلالت کر رہے ہیں

چھٹی حکمت

مفسرین نے اس کی شہادت قرآنِ حکیم کے اس حکم سے دی ہے۔ جب حضرت انسان کو خشوع و خضوع کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو ذہن میں اسی احساس کے جاگزیں ہو جانے کے بعد دل میں تواضع اور انکساری کی اور تذلل و تضرع کی نعمت سے بہرہ ور کر دیتی ہے۔ یہی حالت فی الحقیقت جوہرِ عبادت اور ایمان ہے۔ انسان کو اگر یہ احساس اور قلبی حالت نصیب ہو جائے تو نہ اس سے ظلم و ستم ہو سکتا ہے اور نہ کسی کی حق تلفی۔ گویا استعاذہ کا جوہرِ اصلی یہ ہے کہ انسان کبر و نخوت اور غرور و تمکنت سے پاک عالی صفت، منکسر المزاج اور متواضع انسان بن جائے گا اور ہر معاملے میں اپنے دل کا رشتۂ امید صرف خدائے بزرگ و برتر سے وابستہ رکھے۔

ساتویں حکمت

استعاذہ کا عملی پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے عجز و انکساری کے اعتراف اور خشوع و خضوع کے حصول کے بعد بارگاہِ ایزدی کی طرف کمالِ یقین کے ساتھ متوجہ ہو اور اس سے استمداد کرے اور پھر اس کے لُطف و احسان اور جُود و سخا پر پورا توکل رکھے۔ اسے ہر فتنہ و شر اور خوف و غم سے پناہ بھی ملے گی اور دیگر انعامات سے بھی نوازا جائے گا۔ خدا سے پناہ

مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جان لے کہ مجھے کسی کا شر نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جب اس کے دل سے پوری دنیا کا خوف وخطر نکل جائے تو وہ کسی بھی طاغوتی قوت اور باطل طاقت کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ اسی فکر وعمل کو توحید کہتے ہیں۔ بقول اقبالؒ

ہر کہ رمزِ لا اِلٰہ فہمیدہ است　　　شرک را در خوف مضمر دیدہ است

آٹھویں حکمت

استعاذہ کی ایک حکمت یہ ہے کہ انسان خود کو کبھی بھی کسی شیطانی، طاغوتی اور باطل قوت کے ساتھ سازگاری کے لیے تیار نہ کر سکے۔ جب اس کی دعا یہی ہو کہ اے اللہ میں ہر باطل سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ عارضی و مادی منافع اور مصالح کی خاطر خدا کو چھوڑ کر کذب و باطل سے سازگاری پیدا کرے۔ یہ تعلیم عین روحِ اسلام بلکہ فلسفۂ توحید ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ　(محمدؐ : ۳۵)

پس تم سستی نہ کرو اور (باطل کو) صلح کی طرف نہ بلاؤ اور تم ہی غالب آؤ گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے اعمال (یعنی جدوجہد) بے نتیجہ نہ جانے دیگا

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں مدینہ سے آئے ہوئے وفد سے بیعتِ اسلام لے رہے تھے تو اس بیعتِ اسلام کا مقصد عباس بن عبادہ انصاریؓ نے بڑے واشگاف لفظوں میں بیان کیا :-

انکم تبایعونہ علی حرب الاسود والاحمر من الناس　(سیرت ابن ہشام)

بے شک تم پیغمبرِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر انسانوں میں سے ہر سیاہ و سفید (باطل قوت کے علمبردار) کے ساتھ جنگ کی بیعت کر رہے ہو۔

؎ یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے　　لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

استعاذہ کا فلسفہ یہی ہے کہ خدا کی پناہ میں آکر دنیا میں ہر باطل اور کفر و طاغوت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا جائے۔ شیطنت سے خدا کی پناہ طلب کر کے پھر اپنی عملی زندگی میں کذب و دجل، ظلم و جبر، کفر و عصیاں اور شیطنت کے دیگر مظاہر سے سازگاری پیدا کرنا اور ان کی حمایت کرنا صریح منافقت اور مذہب سے دھوکہ اور فریب ہے۔ اسی وجہ سے قرآن ہر شیطانی قوت کے ساتھ غیر مصالحانہ مخاصمت کی تلقین کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:-

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا　(فاطر : ٦)

بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن سمجھو۔

وجوہِ تقدیم

یہاں ایک اور سوال ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے کہ استعاذہ کا حکم بطورِ خاص تلاوتِ قرآن سے پہلے کیوں ہے؟

[illegible] ہیں ۔ تو
اس قدر کافی و وافی کتاب کی تلاوت پر استعاذہ کیوں مقدم ہے ؟ یہی نکتہ غور طلب ہے ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (النحل : ۹۸)
پس جب تم قرآن پڑھنے لگو تو اللہ کی پناہ مانگو شیطان مردود سے

پہلی وجہ

اس حکم سے یہ اشارہ بڑی صراحت کے ساتھ ملتا ہے کہ شیطانی گمراہی کا اندیشہ اس راستے پر بھی ہے ۔ اس لیے یہاں احتیاط کا دامن تھامنے کی تلقین کی جا رہی ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے ضرور بالضرور شیطان مردود کی حیلہ سازیوں اور گمراہیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کر لو کیونکہ اس راستے پر شیطان کا حملہ تمام حملوں سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہوگا ۔ سورۃ الاعراف میں اس امر کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے :۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (الاعراف : ۱۶)
شیطان بولا ۔ قسم اس کی جو تو نے مجھے گمراہ کیا میں (لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے) ضرور تیرے سیدھے راستے پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا ۔

یہاں یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ جو لوگ پہلے ہی گمراہ ہیں اور راہِ حق کے متلاشی نہیں ہیں یا غلط عقائد و اعمال کے راستوں پر چل رہے ہیں ۔ انھیں بھکانے کی زیادہ فکر شیطان کو نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو پہلے سے ہی اس کے ساتھی ہیں ۔ انھیں صرف اسی قدر دھوکے کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتے رہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہی صحیح ہے ۔ شیطان اپنی تمام تر قوت اور حیلہ سازی صراطِ مستقیم پر گامزن افراد کو بھٹکانے کے لیے صرف کرتا ہے اس کی ساری محاذ آرائی ہی دراصل ان لوگوں کے خلاف ہے جو راہِ ہدایت پر چل رہے ہیں اور راہِ ہدایت بلاشبہ قرآن و سنّت کی راہ ہے ۔ جو لوگ قرآن و سنّت سے اپنے فکر کی آبیاری کرنا چاہتے ہیں اور انھیں سے اپنے خیالات و نظریات کو اخذ کرنا چاہتے ہیں ۔ شیطان انھیں گمراہ کرنے کے لیے اسی سیدھی راہ پر تاک لگائے بیٹھا ہے ۔ جیسا کہ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (میں یقیناً تیرے سیدھے راستے پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا)۔ میں اس امر کی صراحت ہے اگر وہ قرآن و سنّت سے تمسک و اعتصام کی آرزو رکھنے والوں کو گمراہ کر لے تو یہی اس کی کامیابی ہے ۔ دوسروں کو گمراہ کر لینا اس کے لیے چنداں باعثِ فخر نہیں ۔ اس راستے سے گمراہی اس طرح داخل ہو سکتی ہے کہ قرآن پڑھنے والا جس معنی و مفہوم کو قرآنی مدعا سمجھ رہا ہے وہ درحقیقت قرآنی مدعا نہ ہو بلکہ اس کی عقل وہ اسی کو فکرِ قرآنی سمجھ کر اپنے نقطۂ نظر میں پختہ رہے اور اسے اس تحریفِ معنوی کا شعور تک نہ ہو ۔ اس طرح وہ خود کو ہدایت یافتہ اور دوسروں کو گمراہ تصور کرتا رہے حالانکہ یہ اس کی اپنی گمراہی ہو ۔ اسی بات کو قرآن اپنے لفظوں میں

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ (البقرہ : ۲۶)

اور اللہ تعالیٰ اس سے بہت لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت لوگوں کو ہدایت فرماتا ہے اور اس سے نہیں گمراہ کرتا مگر فاسقوں کو۔

چنانچہ تلاوتِ قرآن سے قبل شیطانی حملہ سے بچاؤ کی ضرورت عام حالات سے بھی زیادہ تھی۔ اس لیے اس موقع پر بالالتزام استعاذہ کا حکم صادر کیا گیا۔ تاکہ راہِ ہدایت پر چلتے ہوئے گمراہی کے تمام خدشات سے محفوظ و مامون ہوا جا سکے۔ چور ہمیشہ اسی پر حملہ آور ہو گا جس کے پاس کچھ دولت ہوگی۔ اگر کوئی پہلے سے ہی تہی دامن ہو تو اس پر چور کو زیادہ تحریص نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے حکمِ استعاذہ قرآن پڑھنے پر مقدم ہے تاکہ شیطانی حملہ اور اس کے خطرناک اثرات سے حفاظت کا سامان پہلے تیار کر لیا جائے اور پھر انسان دشتِ تحقیق کا رہ نورد ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن پر بات کرتے ہوئے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آثارِ صحابہ و تابعین اور اکابر امت سے بھی تائید و استشہاد حاصل کر لیا جائے کیونکہ وہ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (سوائے تیرے ان بندوں کے جو چنے ہوئے ہیں) کے تحت شیطانی گمراہی سے محفوظ و مامون ہوتے ہیں ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَاْيِهٖ اَوْ بِمَا لَا يَعْلَمُ فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ

(رواہ الترمذی والنسائی وابو داؤد وابن جریر مرفوعًا)

جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے یا نہ جانتے ہوئے گفتگو کی پس وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنا لے۔

اسی طرح حضور علیہ السلام نے فرمایا :۔

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَاْيِهٖ فَقَدْ اَخْطَاَ

(ترمذی، نسائی، ابو داؤد)

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے بات کی اس نے خطا کی۔

چنانچہ آج ہر شخص تفسیرِ قرآن کی ضروریات و لوازمات پورے کیے بغیر تفسیرِ قرآن کی جسارت کر رہا ہے اور اپنے اپنے ناقص فہم سے قرآنی فکر کی تحریف کر رہا ہے۔ اس لیے اس راستے پر پہلے سے کہیں زیادہ گمراہی کے خدشات پیدا ہو گئے ہیں۔

دوسری وجہ

استعاذہ کی دوسری وجہ تقدیم یہ ہے کہ قرآن طاعتِ الٰہی کا راستہ ہے اور تعوّذ شیطنت سے نجات کا ذریعہ۔ شیطنت سے نجات حاصل کیے بغیر انسان طاعتِ الٰہی کے فوائد و ثمرات سے متمتع نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ قرآن پڑھنے سے پہلے خود کو شیطنت کے غلبہ و نفوذ سے پاک کر لیا جائے۔ تاکہ قرآن کی جملہ برکات و تاثیرات کے قبول کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ تلاوتِ قرآن پر استعاذہ کو اسی طرح مقدم رکھا گیا ہے۔ جس طرح تعلیمِ کتاب و حکمت پر تزکیۂ نفوس کو تاکہ قلب و باطن انوارِ معارفِ قرآن کے اہل ہو جائیں تو تعلیمِ کتاب و حکمت کا فیضان حاصل ہو سکتا ہے۔ ارشادِ باری ہے :۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آلِ عمران : ۶۴)

وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کرتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور پھر انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

تیسری وجہ

استعاذہ کو تسمیہ سے پہلے پڑھنے کا حکم ہے۔ حالانکہ اسلام میں ہر کام کا آغاز تسمیہ (یعنی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) سے کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تسمیہ ذکرِ الٰہی اور حصّہ قرآن ہے۔ اس لیے اس کا درجہ تحلیہ کا ہے۔ جب کہ استعاذہ بمنزلہ تخلیہ کے ہے اور تخلیہ ہمیشہ تحلیہ پر مقدم ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی شخص لباسِ فاخرہ پہننا چاہے تو وہ پہلے بدن کو میل کچیل سے پاک کرنے کے لیے غسل کرتا ہے۔ اسی طرح ذکرِ الٰہی اور اس کے انوار و تجلیات کا لبادہ اوڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ باطنی آلائشوں اور روحانی نجاستوں سے روح کو بالکل پاک کر لیا جائے جو صرف استعاذہ سے ہی ممکن ہے۔ قرآن کے ظاہری مَس کے لیے بھی طہارتِ جسمانی ضروری ہے جیسا کہ حکمِ الٰہی ہے :۔

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ : ۷۹) قرآن کو مَس نہ کریں سوائے باوضو لوگوں کے۔

یہ امر آدابِ تلاوت میں سے ہے۔ اسی طرح استعاذہ بھی روحانی طہارت کا واحد کامل طریقہ ہے۔ جس کے بعد ہی قرآنی ہدایت کے اخذ و حصول کی اہلیت پیدا ہو سکتی ہے۔

چوتھی وجہ

استعاذہ کو تسمیہ پر مقدم کرنے میں لفظی و معنوی مناسبت بھی ہے۔ استعاذہ میں "الشیطان الرجیم" سے پناہ طلب کی گئی ہے اور تسمیہ میں "الرحمن الرحیم" سے تعلق و اتصال کا بیان ہے۔ استعاذہ کے الفاظ میں خدا کی رحمت سے دُوری شقاوت و بدبختی اور محرومی کا ذکر ہے اور ان اوصاف سے نجات پانے کی تمنا کا بیان ہے۔ ادھر اس کے بعد متصلاً تسمیہ کے الفاظ میں خدا کی رحمانیت و رحیمیت کا تذکرہ ہے۔ جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اے انسان تو اپنا دامن گناہوں اور کوتاہیوں سے بچانے کی تمنا تو کر، خدا کا دامنِ رحمت تجھے اپنی پناہ میں لے لے گا۔ جس کے بعد تیری دُوری قُرب سے، تیری شقاوت سعادت سے، اور تیری محرومی لُطف و عنایت سے بدل جائے گی تو خدائے رحمان و رحیم کی حفاظت میں آجائے گا اور اس طرح تجھے دنیا کی کوئی طاقت خیر سے محروم نہ کر سکے گی۔

ارکانِ استعاذہ

امام فخر الدین رازیؒ "تفسیرِ کبیر" میں لکھتے ہیں کہ اس کلام کے پانچ ارکان ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ الاستعاذہ۔ اس سے مراد وہ الفاظ اور کلمات ہیں جن کے ذریعے بارگہِ ایزدی میں تعوّذ کیا جاتا ہے یعنی اَعُوْذُ

بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

۲۔ المستعیذ ۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو استعاذہ کرتا ہے یعنی بارگاہِ الوہیت میں پناہ کا طلب گار ہوتا ہے وہ أعُوذُ کا فاعل ہے ۔

۳۔ المستعاذ بہ ۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے ۔ جس کی پناہ طلب کی جاتی ہے ۔ ان کلمات میں لفظ " اللّٰہ " أعُوذُ کا مفعول بہ ہے ۔

۴۔ المستعاذ منہ ۔ اس سے مراد شیطان رجیم ہے جس سے پناہ طلب کی جاتی ہے ۔

۵۔ اجل الاستعاذہ ۔ اس سے مراد استعاذہ کی حکمت اور غرض و غایت ہے ۔ جس کی خاطر خدا کی پناہ طلب کی جاتی ہے ۔ یعنی شیطان کا وہ خاص شر جس سے محفوظ و مامون ہونے کے لیے استعاذہ کیا جاتا ہے ۔

مندرجہ بالا پانچوں ارکان کی تفسیر اوپر بیان ہو چکی ہے ۔

اِستعاذہ اور تسمیہ کا باہمی تعلق

استعاذہ کا معنی و مفہوم اور اس کا فلسفہ و حکمت سمجھ لینے کے بعد یہ امر بدیہی طور پر سامنے آجاتا ہے کہ انسان نے چونکہ اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں نیازمندی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اپنی بے بسی و بے کسی اور عاجزی و ناتوانی کا اعتراف کر لیا ہے ۔ شیطانی خصائل و رذائل ، طاغوتی فتن و شرور اور ابلیسِ لعین کے بہکاووں سے پناہ مانگ لی ہے ۔ اس لیے اب اسے ذاتِ اُلوہیت کی بے پایاں رحمتوں اور عنایتوں کا مژدۂ جانفزا سنا دیا جانا چاہیئے ۔ اب تو شیطانِ رجیم سے پناہ مانگنے والے کو رحمان و رحیم کا سایۂ عاطفت میسر آ ہی جانا چاہیئے ۔ جس طرح ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ اصل مدعا تو تسمیۂ الٰہی کا لباسِ فاخرہ پہننا تھا ۔ لیکن اس سے قبل ضروری تھا کہ انسان اپنے قلب و باطن کو روحانی آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے غسلِ استعاذہ کر لے ۔ کیونکہ طہارتِ کاملہ کے بغیر انسان باری تعالیٰ کے سرچشمۂ اُلوہیت ، اس کے سرچشمۂ رحمانیت اور اس کے سرچشمۂ رحیمیت سے فیض یاب نہیں ہو سکتا تھا ۔

مستزاد یہ کہ بغرضِ تلاوت بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کا پڑھنا گویا علومِ قرآنی کے بحرِ بے کنار میں غوطہ زن ہونا تھا ۔ ملاح تیراکی سے پہلے ڈوبنے سے بچاؤ کی تدابیر اختیار کر لیا کرتے ہیں ۔ چنانچہ بسم اللہ سے قبل استعاذہ کی تعلیم اس لیے دی گئی کہ انسان شیطان کے گمراہ کن حملوں سے بچنے کے لیے ذاتِ حق کی پناہ طلب کر لے تاکہ وہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے " یَهۡدِیۡ بِهٖ كَثِیۡرًا " کے زمرے میں شامل ہو سکے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ " یُضِلُّ بِهٖ كَثِیۡرًا " کے فریب آفریں بھنور میں پھنس کر گم گشتۂ راہ ہو جائے ۔ اس لحاظ سے بیانِ استعاذہ کی حیثیت درحقیقت مضمونِ تسمیہ کی ضروری تمہید ، حصولِ ہدایت کی محفوظ سبیل اور احتمالِ گمراہی کی حفاظتی تدبیر کی تھی سو وہ پہلے ہو چکی ۔ اب اصل مضمونِ تسمیہ کا آغاز کیا جاتا ہے ۔ اگر استعاذہ اور تسمیہ کے تعلق کو ملخصاً سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یوں کہا جائے گا کہ :۔

۱۔ استعاذہ میں عقائدِ باطلہ اور اعمالِ سیۂ سے پرہیز تھی۔ بسم اللہ میں عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کی طرف رجوع ہے۔

۲۔ استعاذہ میں ماسوٰی سے لاتعلقی اور علیحدگی کا اعلان تھا، بسم اللہ میں توجہ الی اللہ کا باقاعدہ اقدام ہے۔

۳۔ استعاذہ میں ہر قسم کے شر سے حفاظت طلب کی گئی تھی، بسم اللہ میں انعامات وعنایاتِ ایزدی کا سوال کیا جا رہا ہے۔

۴۔ استعاذہ کے ذریعے باطنی طہارت اور روحانی بالیدگی حاصل کی گئی تھی، بسم اللہ کے ذریعے قرآنی انوار و تجلیات کے نزول کا آغاز ہو رہا ہے۔

۵۔ استعاذہ گمراہی سے بچاؤ تھا۔ بسم اللہ ہدایت کا حصول ہے۔

۶۔ استعاذہ عزمِ سفر تھا، بسم اللہ حصولِ منزل ہے۔

۷۔ استعاذہ مریض کے لیے مجوزہ پرہیز تھی۔ بسم اللہ اس کا مجوزہ علاج ہے۔

۸۔ استعاذہ رذائلِ اخلاق اور خصائصِ ذمیمہ سے نجات حاصل کرنا تھا۔ بسم اللہ خود کو اوصاف واخلاقِ الٰہیہ سے متصف کرنا ہے۔

۹۔ استعاذہ بغض و عناد سے برأت کا نام تھا۔ بسم اللہ پیکرِ رحمت و رافت قرار پانے کا نام ہے۔

۱۰۔ استعاذہ خدا کی دوری سے پناہ مانگنے کا نام تھا۔ بسم اللہ اس کے قرب و وصال کی طلب کا نام ہے۔

۱۱۔ استعاذہ اپنی عاجزی کا اعتراف تھا۔ بسم اللہ خدا کی قدرت کا اعتراف ہے۔

۱۲۔ استعاذہ کا آغاز نفسِ امارہ کے شعور اور اس کی مذمت سے ہوا تھا، بسم اللہ کا آغاز "نفسِ لوامہ" و "ملہمہ" کے شعور اور ان کی تحسین سے ہوتا ہے۔

۱۳۔ استعاذہ کا ثمرہ و نتیجہ "نفسِ مطمئنہ" تھا۔ بسم اللہ کا ثمرہ "نفسِ راضیہ و مرضیہ" ہے جو فی الحقیقت "نفسِ کاملہ" قرار پاتا ہے۔

۱۴۔ استعاذہ میں شخصیت کی اصلاح تھی۔ بسم اللہ میں اس کا منتہائے کمال ہے۔

اسی تعلق کی بنا پر ہم نے تفسیرِ تسمیہ کا آغاز حکمتِ استعاذہ کے بیان سے کیا ہے۔ اب ہم تسمیہ کے مفہوم اور فلسفہ کی نسبت چند کلمات عرض کرتے ہیں۔

المطبعة العربية
۳۰۔ ایبک روڈ (انارکلی) لاہور (پاکستان)